آئندہ جولائی کا "نگار" زیادہ ضخیم ہوگا

اور اس میں دو نہایت اہم مضامین اڈیٹر نگار کے قلم سے شایع ہوں گے

۱۔ ڈاکٹر ٹڈل کے ماخذ القرآن پر اصولی گفتگو ——

۲۔ مذہب میں شہوانیات کا عنصر (تاریخی و علمی نقطۂ نظر سے)

علاوہ ان مضامین کے "سن فرانسسکو" کی کانفرنس پر بھی تبصرہ کیا جائے گا

نگار

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

ادارۂ معاون: اخوند فیض محمد فاروقی
مجدد نیازی ۔ شوکت جہاں

جلد ۴۷	فہرست مضامین جون سنہ ۴۵ء	شمار ۶

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲
سرچشمۂ قرآن ۔۔ ابوالفدا محمد عبدالقادر بلیغ اسلام ۔ ۹
پنجابی زبان کی ایک شاعرہ ۔۔ مدن گوپال ۔۔ ۲۲
روح علمی نقطۂ نظر سے ۔ اصطفےٰ السرسوی ۔۔ ۲۶
مکتوبات نیاز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۹
باب الانتقاد ۔۔۔ عبدالوحید خاں اعظمی ۔ ۳۵
روسی اثرات رومانیا میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۵
جنگ کے نئے ہتھیار ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۷
نکاہات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۸
یہ کیا ہو رہا ہے ؟ ۔۔ نظیر حیدر ۔ بی ۔ اے ۔۔ ۴۹
مسولینی ۔ (نظم) ۔۔۔ پروفیسر شور ۔۔۔ ۵۳
غزل مثلث ۔۔۔۔ پروفیسر جمیل مظہری ام ۔ اے ۔۔ ۵۴
انسان کامل (نظم) ۔ رآز رامپوری ۔۔۔ ۵۵
پیشکش (نظم) ۔۔ سلیمان اریب ۔۔۔۔۔
کلام حامد بھوپالی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۶
کلام شعلہ آسبونی ۔۔ غزل ۔۔ دل شاہجہانپوری ۵۷
غزلیں ۔ حسرت ترمذی ۔ رعنا اکبرآبادی ۔ سید علی سجاد تہر ۵۸
مطبوعات موصولہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۵۹

ملاحظات

افسانہ از افسانہ می خیزد

اس بڑی لڑائی کی وہ آگ جو یوروپ میں لگی تھی، آخر کار بجھی، لیکن اس پانچ سال، سات مہینے اور سات دن کے اندر وہ دنیا کو جتنا تباہ کر گئی، اس کا اندازہ مادی و غیر مادی، دونوں حیثیتوں سے مشکل ہے۔ اس موضوع پر کتابیں لکھی جائیں گی، نقوش و تصاویر کے ذریعہ سے اسے سمجھایا جائے گا، لیکن اُس حقیقی سبب کو غالباً کبھی زبان پر نہ لایا جائے گا، جس نے یہ آگ دنیا میں لگائی اور جو آیندہ بھی برابر اس کو مشتعل کرتی رہے گی۔

لڑنے والی قومیں ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ ان کا مقصود لڑائیوں سے امن کو جیتنا ہے، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ امن کبھی حاصل نہیں ہوا اور نہ شاید آیندہ عرصہ تک حاصل ہو۔ ایک زمانہ تھا جب انسان صرف زندہ رہنا چاہتا تھا اور محض بقاء حیات کے لئے وہ گوشت دار جانوروں کے ٹکڑوں، درختوں کے پھلوں اور ایک ایک چشمۂ آب کے لئے ایک دوسرے کا خون بہاتا تھا، اس کے بعد وہ زمانہ آیا، جب انسان نے مذہب کو پیدا کیا اور خدا کے خوش کرنے کے لئے وہ اپنے ابنائے جنس کو حد درجہ بیرحمی کے ساتھ ہلاک کرتا رہا۔ اور ۔۔۔ ابھی یہ عہد جہل و تاریکی پوری طرح ختم نہ ہوا تھا کہ موجودہ تہذیب و تمدن کا دور شروع ہوا ۔۔۔ فضل و کمال کا دور، علم و فراست کا دور، ذہنی عروج و ارتقاء کا دور ۔۔۔ لیکن یہ نوع انسانی کی تباہی کے لئے مذہب سے زیادہ مہلک چیز اپنے ساتھ لایا جس کا نام "قومیت" ہے۔

یہی وہ "قومیت" تھی جس نے جرمنی میں ہٹلر کو اور اٹلی میں مسولینی کو پیدا کیا اور یہی وہ بلا ہے جو جاپان پر مسلط ہے اور اگر سان فرانسسکو کی کانفرنس کو بین الاقوامی امن و سکون کی صورت پیدا کرنے میں ناکام رہی اور تیسری جنگ شروع ہوئی، تو یہ بھی نتیجہ اسی "قومیت" کا ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ہر اس حصۂ زمین میں جہاں کسی قوم کی اکثریت پائی جاتی ہے اسی کی حکومت ہونا چاہئے اور اسی اصول کو سامنے رکھ کر سن فرانسسکو میں کرۂ ارض کو امن و نجات کا بپتسمہ دیا جانا تجویز ہوا ہے، جسے اٹلانٹک چارٹر اور تصفیۂ مبارش اوک بھی کہتے ہیں، لیکن کیا یہ اصطباغ کامیاب ثابت ہوگا، کیا اب دنیا انسانی درندوں کے وجود سے پاک ہو جائے گی، اور کیا اب دُنیا میں شانتی ہی شانتی نظر آئے گی۔

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی!

حکومت کے نظرئے اس وقت تک متعدد پیش کئے جا چکے ہیں، اور بار بار کی یہ کوشش ہی ثبوت ہے اس امر کا کہ ابتک کوئی نظریہ صحیح معنی میں کامیاب نہیں ہوا۔ اول اول دنیا میں بطریقی حکومت قایم ہوئی، جس کا ارتقاء

ملوکیت تھا، اور اب بھی دنیا کے بعض حصوں میں (کہیں اپنے اصلی روپ میں اور کہیں ارسٹقراطی (حکومت امراء) صورت میں) یہ لعنت باقی ہے، لیکن زبانی اور شاید اُصولاً بھی اب سب نے تسلیم کرلیا ہے کہ دورِ ملوکیت کو ختم ہوجانا چاہیئے چنانچہ اس کی جگہ اکثر ممالک میں دیمقراطی (ڈماکریٹک) حکومت نے لیلی ہے جس کو اصطلاحی زبان میں جمہوریت بھی کہتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کی بڑی بڑی جمہوریتیں بھی اسوقت تک دنیا کے اضطراب کو دور نہیں کرسکیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہی جبر و استبداد جو پہلے کلیسائی یا مذہبی اور بعد کو شخصی حکومتوں میں پایا جاتا تھا، اب جمہوریت و قومیت کے نام سے روا رکھا جاتا ہے اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ اگر دورِ ملوکیت میں ملک کی دولت پر صرف ایک شخص کا اختیار ہوتا تھا، تو اب امراء و اعیان کی مخصوص جماعت اس پر قابض ہے، پہلے انسان ایک شخص کا غلام تھا اور اب اسے خراج غلامی پوری جماعت کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے اگر اس کا خون صرف ایک شخص کے قصر و ایوان کی زیبایش میں صرف ہوتا تھا، تو اب وہ ایک سے زاید افراد کے اسباب عیش و تنعم کی فراہمی میں فی نفسہ بُرا نہیں، اگر واقعی وہ کی اصلاح و ترقی کا ضامن ہو، صرف ہوتا ہے۔ "قومیت" کا جذبہ نہیں ہوتا اور اس جذبہ کو صرف بلا فرق و امتیاز قوم کے تمام افراد قوموں کے حقوق چھیننے میں اس سے لیکن اگر اس سے یہ مقصود پورا بڑی لعنت دنیا میں اور کوئی نہیں اس لئے پیدا کیا جاتا ہے کہ دوسری یہی وہ تلخ حقیقت تھی مدد لیجائے تو قومیت سے زیادہ طرف سے بدگمان بنا دیا اور ہوسکتی۔

جنوری ۴۶ء کا سالنامہ
اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص چیز ہوگا
اس کی تفصیل
آیندہ اشاعت میں ملاحظہ ہو

جس نے لوگوں کو جمہوریت کی اشتمالیت اور عدمیت کی صورت میں رونما ہوئی۔ آخر کار انسانی بیزاری اشتراکیت

پچھلی جنگ کے بعد جب روس میں اشتراکیت و اشتمالیت کا تجربہ شروع ہوا تو جمہوریتوں نے اسے نہ صرف شک و شبہ بلکہ مخالفانہ نگاہ سے دیکھا اور بالشیوزم کے خلاف ایک عام پروپاگنڈا شروع کیا گیا کہ وہ مذہب کی دشمن اور اخلاق و تہذیب کو تباہ کرنے والی ہے اور جب باوجود اس پروپاگنڈا کے بھی اس کے جراثیم یوروپ میں پھیلتے نظر آئے تو اندرونی طور پر بالشیوزم کو فنا کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں، اور انھیں تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ جرمنی کو پوری طرح مسلح ہوتے رہنے کا موقعہ دیا گیا تاکہ وہ روس کی اشتراکیت اور یوروپ کی جمہوریت کے درمیان ایک مضبوط حد فاصل بن جائے اور ضرورت کے وقت اسے اشتراکیت سے ٹکرا دیا جائے، لیکن یہ خبر نہ تھی کہ جرمنی مسلح ہوکر پہلے خود دوستوں ہی کو اپنا شکار بنائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا جب جمہوریتوں کو خود اشتراکیت ہی سے ملکر جرمنی کی مسلح ناتسیت کا مقابلہ

کرنا پڑے گا۔

اس لڑائی میں جرمنی نے روس پر کیوں دفعتاً حملہ کیا، اس کے اور اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن ایک بات بالکل یقینی ہے اور وہ یہ کہ روس کی قوت اور بالشیوزم کی مقبولیت دونوں کا جرمنی نے بالکل غلط اندازہ کیا۔ فن لینڈ میں روسی فوجوں کی کمزوری سے جرمنی کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملا کہ نہ سرخ افواج اس قابل ہیں کہ اس کی قوت کا مقابلہ کر سکیں اور نہ روس کا ملک بالشیوک حکومت سے خوش ہے، اس لئے حملہ ہوتے ہی سارا ملک بالشیوک حکومت کا ساتھ چھوڑ دے گا اور اس کے فشون قاہرہ نہایت آسانی کے ساتھ اشتراکیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں گے۔ یہ مغالطہ جرمنی کے علاوہ شاید یورپ کی اور بڑی بڑی حکومتوں کو بھی رہا ہوگا، لیکن جب امتحان کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ ممکن ہے روسی عساکر بھی اتنی ہی طیار ہیں جتنی جرمن افواج، اور ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ روسی آبادی بالشیوزم اصول حکومت کو اپنے لئے رحمت سمجھتی ہے اور اس طرح اس جنگ سے اگر کوئی فایدہ دنیا کو پہونچے یا نہ پہونچے لیکن یہ فایدہ ضرور ہوا کہ اشتراکیت کی حقیقت ساری دنیا پر بے نقاب ہوگئی۔

میں اس وقت نہ اشتراکیت کے اصول کو پیش کرنا چاہتا ہوں اور نہ یہ کہنے کے لئے آمادہ ہوں کہ وہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے ہر ملک کے لئے یکساں طور پر مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس حد تک دنیا کے مستقبل اور اس کے نظام جدید کا اصولی تعلق ہے، یہ ظاہر کرنے میں مجھے تامل نہ کرنا چاہئے کہ اگر واقعی دنیا میں پایدار امن و سکون قایم کرنا مقصود ہے، تو اسکی جستجو ڈیماکریسی اور استعماریت میں نہ کرنا چاہئے، جو "قومیت" کو قومی تفوق و بلندی حاصل کرنے کے لئے نہایت مکروہ قسم کی سرمایہ دارانہ، ملوکانہ و آمرانہ حکومتوں میں تبدیل کر دیتی ہے بلکہ اس سے ہٹ کر ان اصول میں اسے ڈھونڈھنا چاہئے جو قومی دولت و قومی سرمایہ کو کسی مخصوص جماعت کی ملکیت قرار نہیں دیتے اور جو بلا امتیاز نسل و رنگ نوع انسانی کے تمام افراد کو عطایائے قدرت سے فایدہ اٹھانے کا یکساں حقدار سمجھتے ہیں۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ناتسیت و فاستیت، جمہوریت ہی کے غلط استعمال کا ردِ عمل تھی اور ضروری تھا کہ جمہوریت اس درمیانی منزل سے گزر کر یا تو رجعت قہقری کے بعد پھر ملوکیت میں تبدیل ہو جائے یا آگے بڑھ کر اشتراکیت سے ہاتھ ملائے اور اب اسی فیصلہ کا وقت ہے جس کے سامنے بڑے بڑوں کے کلیجے تھر تھرا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس کی پامردی، برطانیہ لی فراست اور امریکہ کی دولت نے اس لڑائی کو جیتا ہے اور انھیں تینوں قوتوں کو ملکر دنیا کا نیا نظام مرتب کرنا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب جنگ کے زمانہ کا اتحاد جنگ کے بعد بھی قایم رہے، اور دولت و زر کی بھوک ان کو باہمد گر دست و گریباں ہونے پر مجبور نہ کر دے۔ اس لئے وقت کا سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا "نئی دنیا" کے نظام میں، حکومت کے نظریوں کا وہ اختلاف جو اس جنگ کے باعث ہوا تھا مٹے گا یا نہیں اور اگر نہ مٹا تو پھر آیندہ امن و سکون کی توقع کیا ہو سکتی ہے۔

اس وقت دنیا کی نگاہیں سن فرانسسکو کی طرف لگی ہوئی ہیں، جہاں اس وقت وہی ہنگامہ برپا ہے، جو شاید کرۂ زمین کی آفرینش کے وقت عناصر میں پایا گیا ہوگا اور اگر یہ ہنگامہ کوئی اور تازہ جنگ چھیڑے بغیر ختم ہوگیا تو غالباً یہ انسان کی عقل سلیم کا نتیجہ نہ ہوگا۔ بلکہ نتیجہ ہوگا صرف مصلحت و دور اندیشی کا جس میں خلوص کم اور خوف کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ جن اصول پر سن فرانسسکو میں دنیا کی تقسیم کا مسئلہ پیش کیا جا رہا ہے، وہ اپنے اندر بہت سی بیچینیاں چھپائے ہوئے ہے جن کا جلد یا بدیر ابھرنا لازم ہے ـــــ کہا تو یہ جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں دنیا کی تمام قوموں کو مکمل آزادی کا حقدار سمجھ کر "جدید نظام عالم" مرتب کیا جائے گا۔ لیکن جب تک دنیا میں آزادی مانگنے اور دینے کا دستور قایم ہے، صحیح آزادی کسی کو نہیں مل سکتی، صحیح آزادی دنیا میں ہمیشہ حاصل کیجاتی ہے اس کی بھیک نہیں مانگی جاتی اور نہ بخشش و عطا کی طرح وہ کسی کو دیجا سکتی ہے۔ پھر جب ان حقایق کو سامنے رکھ کر ہم سن فرانسسکو کے حال پر غور کرتے ہیں، تو اس کے مستقبل کی طرف سے تو نہیں، لیکن دنیا کے مستقبل کی طرف سے ضرور مایوسی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ سب سے پہلی گفتگو وہاں "ٹرسٹی شپ" اور "مینڈیٹ" یعنی "تولیت" و "سیادت" کے متعلق شروع ہوئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پہلے جس گرفت میں تھی وہ اب بھی بدستور باقی رہے گی اور اس "نظام جدید" میں بھی اسے غلام ہی بنا رہنا ہے۔ یہ تو ہے عمومی فضا اس کانفرنس کی جو یقیناً مایوس کن ہے۔ اب رہے وہ خصوصی مطالبات جو "اکابر ثلثہ" کے درمیان رد و قبول کے جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں، سو وہ نہ صرف مایوس کن بلکہ ایک حد تک خطرناک بھی ہیں اور ہوسکتا ہے کہ باتوں ہی باتوں میں تلوار کھینچنے تک کی نوبت آجائے۔

برطانیہ صاف صاف کہہ چکا ہے کہ جو چیز اس کی تھی وہ اسی کی رہے گی۔ امریکہ کا کہنا یہ ہے کہ بعض چیزیں جو میری نہیں تھیں اب انھیں میرا ہونا چاہئے، روس کہتا ہے کہ اگر "تولیت و سیادت" ہی کے اصول پر دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے بھی ایشیائے بعید کے بعض حصوں پر تولیت و سیادت کا حق حاصل نہ ہو۔

الغرض یہ ہے وہ آپا دھاپی جس کا مظاہرہ اس کانفرنس میں ہو رہا ہے اور دل کے جو کانٹے آہستہ آہستہ زبان پر آرہے ہیں، وہ کافی تشویش انگیز ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روس کے اثرات ریاستہائے بلقان میں زیادہ وسیع ہوتے جاتے ہیں، بالشک ریاستوں کو بھی وہ اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرنا چاہتا، پولینڈ کے مشرقی نصف حصہ کو بھی وہ ہاتھ سے دیدینے پر راضی نہیں اور نہ وہاں کوئی ایسی حکومت قایم ہونے دینا چاہتا ہے جو روس کی مخالف ہو، فنلینڈ سے جو معاہدہ وہ کرچکا ہے، اس میں بھی کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتا، کمیونسٹ چین میں جو سیاسی اثرات اس کے پیدا ہوچکے ہیں ان سے بھی وہ فایدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ جاپان سے بھی وہ اپنی پرانی شکست کا بدلہ لینے کے لئے بعض کھوئے ہوئے حصے واپس لینا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر یہ سب کچھ روس کی مرضی کے مطابق طے پاگیا، تو یہ برطانیہ و امریکہ کی سیاست کی بڑی شکست ہوگی، جسے یہ کبھی گوارا

نہیں کر سکتے۔

اس لئے ان حالات میں اگر تیسری جنگ کا خطرہ سامنے ہے اور قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ نئی دُنیا کی تعمیر پُرانی دنیا کی کامل تخریب ہی کے بعد ہو سکتی ہے تو پھر یہ خطرہ برداشت کرنا ہی ہے۔

خیال تھا کہ دُنیا کی وہ حکومتیں جو کسی نہ کسی طرح اس جنگ سے متاثر ہوئی ہیں، آیندہ کے لئے سنبھل جائیں گی اور وہ پھر اس خطرناک راہ کو اختیار نہ کریں گی، جو اس کشت وخون کا باعث ہوئی تھی، لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ ابھی زمین کے خونی دھبے خشک بھی نہیں ہوئے کہ پھر وہی حریصانہ ذہنیت اُبھرنے لگی اور تماشا یہ ہے کہ اس ذہنیت کا اظہار سب سے پہلے فرانس کی طرف سے ہوا ہے، جس کا کوئی جنگی کارنامہ ہمارے سامنے نہیں ہے ـــــ ڈی گال، آزاد فرانسیسی جماعت کا قایداعظم سہی، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر اتحادی مدد نہ کرتے تو شاید اسے کبھی فرانس کی سرزمین دیکھنا نصیب نہ ہوتی، لیکن اب اُس کی نیت کا یہ حال ہے کہ سن فرانسسکو کی کانفرنس ابھی ختم بھی نہیں ہوئی کہ وہ بیروت میں اپنی فوجیں اُتار کر شام ولبنان کی حکومتوں کو پھر اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔

اسی جنگ میں جب جرمن اور وشی حکومت کی فوج کو یہاں سے نکالا گیا تھا تو اُصولاً یہ بات طے ہو گئی تھی کہ یہ عرب حکومتیں خود مختار رہیں گی اور ان کی آزادی کی ذمہ داری برطانیہ اور امریکہ دونوں نے لی تھی، لیکن ڈی گال نے اس کی مطلق پروا نہیں کی اور یہ سمجھ کر کہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دبا لینا آسان ہے، پھر اسی استعماری پالیسی کو اختیار کیا۔ جسے عرب قوم کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔

چونکہ برطانیہ وامریکہ نے ان عرب حکومتوں کی آزادی کی ظرفداری اس لئے کی تھی کہ جاپان کے خلاف جنگ قایم رکھنے کے لئے مشرق وسطی ہی سب سے بڑا فوجی مرکز ہوگا، اس لئے یقین ہے کہ ڈی گال کی توقعات پوری نہ ہوں گی لیکن ان حرکتوں سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جب فرانس ایسی حکومت کی (جسے اس وقت بالکل کمیونسٹ حکومت کہنا چاہئے) ذہنیت یہ ہے تو اور دوسری حکومتوں کا کیا حال ہوگا۔

ایک اور ہنگامہ جس کے نتائج بہت دور رس ہیں، بندرگاہ ٹریسٹ کا ہے۔ یہ علاقہ اٹلی کے قبضہ میں تھا جسے یوگوسلیویا کے مارشل ٹیٹو نے فتح کر کے آزاد کرایا ہے۔ اب مارشل ٹیٹو اسے یوگوسلیویا میں شامل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے چھوڑنے پر راضی نہیں۔ اگر معاملہ صرف ٹیٹو اور یوگوسلیویا کا ہوتا تو چنداں اہم بات نہ تھی، لیکن چونکہ اسوقت یوگوسلیویا بلقان کی اور دوسری ریاستوں کی طرح بالشویک اثرات سے متاثر ہے، اس لئے ٹریسٹ کا مسئلہ بھی روس کا مسئلہ بن گیا ہے اور یوں آسانی سے اسے نہیں سلجھایا جا سکتا۔

الغرض دُنیا اس وقت برزخی دور سے گزر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور سن فرانسسکو میں کرۂ زمین کے باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کن اُصول پر کیا جائے گا ـــ حالانکہ اگر دنیا میں امن وسکون پیدا کرنا ہے

تو اس کا صرف ایک ہی اُصول ہے اور وہ یہ کہ دُنیا کی تمام قوموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور متمدن قومیں، غیر متمدن قوموں کو مہذب و شائستہ بنانے کی ذمہ داری سے ہاتھ اُٹھا کر اپنی اس محبّت و ہمدردی سے ہم کو زیادہ گرانبار احسان نہ بنائیں۔

ہوئے تم دوست جسکے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

ماخذ القرآن کی بحث

یہ مسئلہ اب اُس منزل پر پہونچ گیا ہے، کہ اس کو اِدھر یا اُدھر ختم ہو جانا چاہیئے۔ ہمارے علماء کرام بالکل خاموش ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا خاموش رہنا ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص معقول بات نہ کہہ سکتا ہو تو دانشمندی یہی ہے کہ سکوت اختیار کیا جائے۔

اس دوران میں قارئین نگار کے متعدد خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں، جن میں تقاضہ کیا گیا ہے کہ بلا کسی مزید انتظار کے مجھے خود اپنی رائے اس مسئلہ میں ظاہر کر دینا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ مطالبہ ان کی خواہش کے لحاظ سے بالکل درست ہے، لیکن شاید انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان اعتراضات کا جواب دینے کی ذمہ داری مجھ پر عاید نہیں ہوتی، کیونکہ میں بہت سی اُن باتوں کو مانتا ہی نہیں، جن پہ اعتراض کیا گیا ہے اور اسی لئے میں نے ابتدا ہی میں ظاہر کر دیا تھا کہ علماء کرام کے جوابات کا صرف تبصرہ میرے ذمہ ہوگا ـــــ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا کہ ہندوستان کے اکابر علماء میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جواب کا ایسا پہلو اختیار کرے گا جو مسلمانوں کے عام اعتقادی نظریوں کو دنیا سے تسلیم کرا سکے اور اس طرح میں خود گمراہی سے نکل کر "صراط مستقیم" پر آجاؤں گا۔ میرا یہ اقدام مناظرانہ نہ تھا بلکہ صرف متعلمانہ تھا۔ میں اس بحث میں اُن کے علم و فضل کا امتحان لینا نہ چاہتا تھا بلکہ اس سے خود فایدہ اُٹھانا چاہتا تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس تحریک کے ابتدا ہی میں ان کی نیو ریوں پر بل پڑ گئے اور ان کی بدگمانیوں اور سرکہ پیشانیوں نے جنھیں میں نہ سہی مگر دنیا بجا طور پر ان کی نااہلی قرار دے سکتی ہے، میرے اس اقدام کو بجائے مفید ہونے کے مضرت رساں بنا دیا۔ ـــ بہر حال اب کہ نوبت "کار از دو اگزشتہ و افسوں نہ کردہ کس" تک پہونچ گئی ہے، اس بحث کو کسی نہ کسی طرح ختم کرنا ہے اور آیندہ اشاعت (جولائی) میں تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ میں ٹسڈل کے ان اعتراضات کو کیا سمجھتا ہوں اور اس سلسلہ میں بالکل آخری مرتبہ یہ ظاہر کر دوں گا کہ میرا نظریہ اسلام و تعلیمات کے متعلق کیا ہے۔ اور اس طرح جولائی کے بعد میری طرف سے یہ بحث قطعاً نگار میں ختم ہو جائے گی۔ ہے علماء کرام سو ان کے ارشادات کی اشاعت کے لئے نگار کے صفحات ہمیشہ وقف رہیں گے، کیونکہ میں آخری سانس ختم ہونے تک، اپنے دل کے دروازے صداقت و حقیقت کی روشنی کے لئے کھلے رکھنا چاہتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ انتظار کی انھیں ساعتوں میں کوئی لمحہ ایسا بھی آجائے کہ میں شاہد حقیقی کو بے نقاب دیکھ سکوں اور میرا یہ شیوۂ تسلیم ہی میرے لئے شمع ہدایت بن جائے۔

کہ اینجا از نم یک جبہہ می ریزند کوثر ہا

۴۶ء کا سالنامہ

کیسا ہو، کس موضوع کے لئے وقف ہو اور کس کس کو شرکت کی دعوت دی جائے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی فیصلہ میں اسوقت تک نہیں کر سکا۔

مذہبیات کے متعلق جو کچھ مجھے کرنا تھا وہ کر چکا اور جو باقی ہے وہ ۴۵ء ہی کے اندر ختم ہو جائے گا، اس لئے اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رہا سلسلۂ "ادبیات" سو اس موضوع پر بھی اس وقت تک نگار کے اتنے سالنامے نکل چکے ہیں کہ اگر اس کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

اب تیسری چیز جو شاید "مذہب و ادب" دونوں سے زیادہ ضروری ہے، "سیاسیات" ہے کیونکہ اس جنگ عظیم کے بعد یقیناً دنیا کو نئی کروٹ لینا ہے، اور ہم میں سے ہر شخص کو ابھی سے سمجھ لینا ہے کہ اس "تعمیر جدید" میں انسانی و قومی دونوں حیثیتوں سے اس کے فرایض کیا ہونا چاہئے اس سلسلہ میں جنگ عظیم کے نتائج، تعمیر بعد از جنگ، جدید بین الاقوامی مسایل، دنیا کی اقتصادی و سیاسی گتھیاں، "دنیائے جدید" کی حکومتوں کے نظرئے، مستقبل کے تاریک پہلو، اور اسی طرح کے بہت سے مسایل ایسے ہیں جن پر ہم کو غور کرنا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ آیندہ سالنامہ اس گفتگو کے لئے وقف کر دیا جائے۔

ایک اور چیز جس پر ابتک بہت کم توجہ کی گئی ہے وہ ادبیات ہی کے سلسلہ کی ہے یعنی "فن نقد" — اور بعض احباب کی رائے ہے کہ آیندہ سالنامہ اسی موضوع پر شایع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم کو دیکھنا ہوگا کہ محض فنی حیثیت سے "نقد و انتقاد" کیا چیز ہے، اس کے کیا شرائط ہیں، دنیا کی قوموں نے اس کے کیا اصول مقرر کئے ہیں اور ہماری ادبی زندگی کو اس کی کتنی ضرورت ہے، اور ہمارے لٹریچر میں اس کا اضافہ کس قدر ضروری ہے۔

یقیناً یہ تجویز بھی بہت اہم ہے، اور میں اس پر بھی غور کر رہا ہوں۔

ان کے علاوہ ایک تیسری تجویز اور بھی ہے، وہ یہ کہ ۴۶ء کے اختتام کے ساتھ نگار کی عمر کے ۲۵ سال ختم ہو جائیں گے اور ۴۷ء کا سالنامہ اس کا جوبلی نمبر ہوگا، جسے کم از کم ۲۵۰ صفحات کا ہونا چاہئے، لیکن چونکہ اس کا امکان ہے کہ کاغذ کی کمیابی ۴۷ء میں بھی اتنے بڑے ضخیم سالنامہ کی اشاعت کی اجازت نہ دے، اس لئے کیوں نہ جوبلی نمبر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کا پہلا حصہ ۴۶ء کا سالنامہ قرار دیا جائے اور دوسرا حصہ ۴۷ء کا سالنامہ — ان دونوں حصوں میں کیا ہوگا اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن خیال یہ ہے کہ جوبلی نمبر کے دونوں حصوں کو اس طرح مرتب کیا جائے، کہ آپ ایک طرف، مدیر نگار کی شخصیت سے بھی پوری طرح واقف ہو جائیں اور دوسری طرف نگار نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے وہ اس طرح آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے کہ اگر اس کے بعد نگار فنا بھی ہو جائے تو آپ کو افسوس نہ ہو۔

بہر حال ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، کیونکہ اس باب میں مجھے پہلے قارئین نگار کی رائیں معلوم کرنا ہیں جو غالباً اخیر جون تک معلوم ہو جائیں گی اور میں جولائی میں عرض کر سکوں گا کہ ۴۵ء کا سالنامہ کیا اور کیسا ہوگا۔

نیاز

مکتوباتِ نیاز

گرامی عزیز - معاف فرمائے، آپ کے خط کا جواب غیر معمولی تاخیر سے جا رہا ہے، آپ جانتے ہی ہیں کہ اس موسم میں میرا کیا حال ہوتا ہے - دُنیا فصلِ بہار میں دیوانہ ہوتی ہے اور میں خزاں میں -!

آپ نے غالب کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بالکل متفق ہوں، اُردو فارسی دونوں میں اسکی انفرادیت عدیم المثال ہے، لیکن اگر میں اس کے اُردو کلام کا انتخاب کرتا تو یقیناً دیوان کے بعض موجودہ اشعار حذف کر دیتا اور چھٹے ہوئے اشعار میں سے بعض شامل کر لیتا۔

ناسخ کا ایہام اور مبالغہ اس میں شک نہیں ایک وبا تھی جس میں لکھنؤ سے لیکر دہلی تک ہر شاعر کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہوا - شاہ نصیر نے تو خیر اسی کی بدولت اپنی شاعری تباہ کی، لیکن حیرت تو غالب پر ہے کہ وہ بھی اس چوچلے میں گرفتار ہو گیا -

میں نے ایک بار غالب کے ایسے اشعار کا انتخاب شروع میں کیا تھا جو ایہام و ناگوار مبالغہ کی وجہ سے نظری ہونے کے قابل ہیں، اور ارادہ تھا کہ ایک مقالہ کے ساتھ انھیں پیش کر دوں گا، لیکن یہ خیال اب تک پورا نہ ہو سکا - اب آپ اس کے لئے آمادہ ہیں تو میں یہ انتخاب آپ کے پاس بھیجدوں گا، اگر ملگیا، مثالاً چند اشعار اس قسم کے اسی وقت سن لیجئے:

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہئے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا.

دم سے مراد یہاں تلوار کی باڑھ ہے لیکن چونکہ سانس کو بھی دم کہتے ہیں، اس لئے اس کی رعایت سے "سینۂ شمشیر" بھی پیدا کیا گیا اور دم کا باہر آنا بھی - ورنہ دراصل پہلے مصرعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ "جذبۂ بے اختیارِ شوق" کا یہ کوئی ثبوت ہے -

بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

اس شعر میں ایہام تو نہیں، لیکن محض کاوش کی رعایت سے دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہو گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ "قطرۂ خوں" میں کاوشِ مژگاں سے سوراخ ہو جانا اور اس کا رشتۂ تسبیح میں پروئے ہوئے دانۂ مرجاں کی صورت

اختیار کرلینا کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشۂ نیستاں کا،

فارسی کا محاورہ ہے "خس بدنداں گرفتن" اور اس کا مفہوم ہے اظہارِ عجز کرنا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "اظہارِ عجز کے لئے جب میں نے تنکا دانتوں میں لیا تو وہ بھی ریشۂ نیستاں ہوگیا۔ اور سطوت قاتل بھی مجھے نالہ کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔ چونکہ نے، نیستاں ہی میں پیدا ہوتی ہے اور نے کی فریاد مشہور چیز ہے، اس لئے محض تنکے کی رعایت سے یہ طومار باندھ دیا۔

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گردِ اب تھا

اس شعر میں ایہام تو نہیں لیکن رعایتِ لفظی اور مبالغہ کا اہمال یقینی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ "رات میرے برقِ سوزِ دل کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہوگیا اور اس پانی میں جو بھنور پڑتا تھا وہ شعلۂ جوالہ نظر آتا تھا"

محض اس لئے کہ سوزِ دل کو برق کہا گیا، ابر، گردِ اب اور شعلۂ جوالہ لائے گئے ورنہ ان کے استعمال کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

ناگوار مبالغہ کی ایک مثال اسی غزل کا یہ مصرعہ بھی ہے:

گریہ سے یاں پنبۂ بالش، کفِ سیلاب تھا

اتنا رونا کہ تکیہ کی روئی سیلاب کا کف بن جائے، حد درجہ لایعنی بات ہے

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

سیلاب کے آنے سے دل اتنا خوش ہے گویا خانۂ عاشق جلترنگ (باجا) ہوگیا ہے۔

سیلاب کی وجہ سے "نشاط آہنگی" کا ثبوت دینے کے لئے، شاعر نے گھر کو جلترنگ کہدیا، ورنہ ظاہر ہے کہ جلترنگ سے ایک سیلاب زدہ گھر کو کیا واسطہ!

ایک اور غزل کے یہ دو شعر بھی بالکل اسی قسم کے ہیں:

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا بے تکلف داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا،

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا،

مدعا یہ کہ شراب کا قطرہ فرطِ حیرت سے منجمد ہوگیا اور پیالہ کا خط ایسا نظر آنے لگا جیسے تاگہ میں موتی پروئے گئے ہوں۔

اول تو حیرت کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا گیا دوسرے یہ کہ "خطِ جام" بھی ایک فرنسی چیز ہے، اور پھر یوں بھی شراب کی بوندوں کا جم جانا اور خطِ جام کا موتیوں کے ہار کی طرح نظر آنا، کس قدر غیر پسندیدہ مبالغہ ہے۔

علاوہ مبالغہ و ایہام کے غالب نے بعض اشعار میں استعارے و کنائے بھی اس قدر ضعیف اور بعید الفہم استعمال کئے ہیں کہ کوئی لطف ان سے پیدا نہیں ہوتا، مثلاً:

بکِ ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا، یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ باغ کا کوئی حصہ بیکار نہیں۔ یہاں تک کہ باغ کی روش (جادہ) پر بھی لالہ ہی لالہ پھولا ہوا ہے۔

جادہ، چونکہ فی الجملہ فتیلہ سے مشابہت رکھتا ہے اور داغ، چراغ سے اس لئے غالب کی دشوار پسند طبیعت نے یہ استعارۂ بعید ڈھونڈھ نکالا۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا،

اس شعر کا پہلا مصرعہ باوجود دقیق فارسی ترکیب کے نہایت اچھا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں نہایت بعید الفہم تعبیر سے کام لیا گیا ہے۔ مقصود یہ کہنا ہے کہ شراب پئے بغیر عالم ہوش کے جھگڑوں سے نجات ممکن نہیں، لیکن ہماری پست حوصلہ نے جامِ شراب میں بھی ایک خط کھینچ دیا ہے کہ اس سے زیادہ پینے پلانے کی کوئی صورت نہیں

یہ غزل پوری کی پوری اسی رنگ کی ہے۔

اس کے بعد کی غزل "پنہاں سمجھا" بھی سوائے مقطع کے بالکل اسی رنگ کی ہے۔ علاوہ ان کے، ناموس تھا، لیلیٰ آشنا، رخسار دوست، بیاباں پر، گردن پر وغیرہ متعدد غزلیں، اس قابل ہیں کہ ان کو دیوان سے نکال دینا چاہئے، اس طرح ایک چوتھائی حصہ تو کم ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد جو کچھ رہ جائیگا وہ ایسی چیز ہوگی، جس کا جواب نہ ہوگا۔

غالب کی وہ خصوصیت جو کسی اور کے کلام میں نظر نہیں آتی، اس کا اچھوتا پن ہے، وہ معمولی سی بات کو بھی ایسے عجیب و غریب زاویہ سے پیش کرتا ہے کہ سنکر اچنبھا سا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس کی یہی خصوصیت دشوار گوئی کے سلسلہ میں تو ذوق پر بار ہو جاتی ہے، لیکن اس کی سہل و آسان اشعار میں معجزہ نظر آنے لگتی ہے۔

شعراء کا دستور ہے کہ قافیہ کو سامنے رکھ کر، مضمون کی جستجو کرتے ہیں، پھر بعض قوافی تو ایسے ہوتے ہیں کہ پورے شعر کا مفہوم اپنے ساتھ لاتے ہیں اور بعض کے لئے مضمون کی جستجو کرنا پڑتی ہے اور ایک شاعر کا کمال یہی ہے کہ اگر کوئی مضمون پامال بھی سامنے آئے تو اندازِ بیان سے اس میں جدت و شگفتگی پیدا کر دے اور یہی وہ خصوصیت غالب کی ہے جس میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

اس کی ایک غزل ہے، مرد تھا، فرد تھا۔ اس میں اس نے قافیہ درد کا بھی نظم کیا ہے، لیکن نہایت بدیع انداز سے۔ "درد تھا" پر غور کرنے کے بعد ایک شاعر کی نگاہ سب سے پہلے یقیناً دل ہی کی طرف جاتی ہے اور سامنے کی یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ "دل میں قیامت کا درد تھا" یا اسی مفہوم کا کوئی اور فقرہ، لیکن غالب نے جس زاویہ سے اس قافیہ کو پیش کیا ہے وہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک پہلا مصرعہ اس کے ذہن میں نہ ہوتا اور "دل کا درد" "دل جانے کے درد" کے مفہوم میں کہنا ہر شاعر کا کام نہ تھا۔

رازداں اپنا، آستاں اپنا والی پوری غزل اسی قسم کی ندرت و جدت سے معمور ہے۔ پاسباں اپنا کہکر کوئی شاعر ان دونوں لفظوں کے ربط کو ایک دوسرے سے جدا کر کے یہ مصرعہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ:

بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں، اپنا

اور پھر اس پر جو پہلا مصرعہ لگایا ہے اسے غالب ہی کہہ سکتا تھا۔

ایک شاعر "ان کے پاسباں کو اپنا آشنا" کہکر پہلے مصرعہ میں زیادہ سے زیادہ یہی سوچ سکتا تھا کہ "اب ہم اپنے نکالے جانے کی طرف سے مطمئن ہو گئے ہیں" لیکن یہ کہنا کہ:

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

غالب کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔

جذباتی غزلوں میں یہ التزام بہت مشکل ہے، لیکن غالب کی جدت پسند طبیعت یہاں بھی اپنا کام کر جاتی ہے اس کی ایک بڑی مشہور غزل ہے۔ "چراغاں کئے ہوئے" اور اس میں شک نہیں کہ جذبات تغزل کے لحاظ سے بڑی معیاری چیز ہے، لیکن اس میں ہر قافیہ کا صرف بالکل نئے پہلو سے ہوا ہے۔ پریشاں، جاناں، عنواں، نمکداں، درباں، طوفاں بالکل سامنے کے قافیے ہیں اور گو ردیف کی دشواری نے ان کے صرف کو مشکل بنا دیا تھا، پھر بھی پیش پا افتادہ بہت سے مضمون موجود تھے، لیکن ان قافیوں کو غالب نے جس ندرت و تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے میں اسے شاعری کا معجزہ کہتا ہوں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے
پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم، تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

آنسو کو موتی سے زیادہ آبرو کی چیز سمجھنا، بہت پیش پا اُفتادہ مضمون ہے، لیکن دیکھئے غالبؔ نے کس لطف و نادر انداز سے اس مفہوم کو پیش کیا ہے:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

"تر دامنی" معصیت کے معنی میں آتا ہے اور سبھی نے اس کا استعمال کیا ہے۔ لیکن غالبؔ کی ندرت پسندی ملاحظہ ہو:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس مفہوم کو بالکل نئے پہلو سے ایک اور شعر میں یوں ظاہر کرتا ہے:

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالبؔ کی نگاہ اس درجہ غایر تھی کہ وہ معمولی باتوں میں بھی ایک خاص عظمت و جلالت پیدا کر دیتا ہے۔

بیاباں کا تصور بہت عام ہے اور شاعر و غیر شاعر سبھی اس سے واقف ہیں، لیکن شاید غالبؔ ہی پہلا شخص تھا جس کا تصور اس حقیقت کی طرف گیا کہ:

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مشکل زمینوں میں شگفتہ اشعار نکالنا، مصحفی کا حصہ تھا اور اس باب میں کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں، لیکن غالبؔ کے یہاں بھی ہم کو اس کی بڑی پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں۔ "خوں وہ بھی۔ جنوں وہ بھی" اس کی بڑی مشہور غزل ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ "وہ بھی" بڑی ٹیڑھی ردیف ہے، لیکن غالبؔ کے تمام اشعار سانچہ میں ڈھلے ہوئے ہیں اور جس تیور کے ساتھ اس نے یہ غزل لکھی ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں مل نہیں سکتی۔ اور خصوصیت کے ساتھ مقطع تو اس بلا کا لکھ گیا ہے کہ اس کو سنکر ہم ساکت تو رہ سکتے ہیں، لیکن کہہ کچھ نہیں سکتے۔

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

باوجود دشوار پسندی اور دقیقہ سنجی کے غالبؔ کے یہاں سوز و گداز اتنا ہے کہ وہ کتنی ہی مشکل زمین کیوں نہ

استعمال کرے دل پر اثر ضرور ہوتا ہے - یہ غالباً اس وقت کے ماحول کا نتیجہ تھا، سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ اسکے سامنے گُل ہوا، امراد شرفاء پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں وہ خود اس نے اپنی آنکھ سے دیکھیں، اس لئے اسکا دل بہت دُکھا ہوا تھا اور عیش و نشاط کا ذکر بھی وہ بغیر آہ اور کراہ کے نہیں کرسکتا تھا چنانچہ دیوان غالب میں اگر جستجو کی جائے تو خدا جانے کتنے اشعار ایسے ملیں گے جو "شہر آشوب" اور "مرثیہ" کا رنگ رکھتے ہیں۔ ایک مشکل زمین کے چند شعر سنئے:

گلشن میں بند و بست بہ رنگ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج،
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلاب گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

کیا اس سے زیادہ دردناک الفاظ میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی و گرفتاری کا مرثیہ کہا جا سکتا ہے؟

سلطنت مغلیہ کی مٹی ہوئی عظمت کا بیان انھوں نے اکثر جگہ مختلف انداز سے کیا ہے اور کہیں کہیں تو پوری غزل اس کے لئے وقف کردی ہے۔ ملاحظہ ہو:

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — ایک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
اے تازہ وارد انِ بساطِ ہوائے دل، — زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو، — میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں، — نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی، — اک شمع رہگئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

کہاں تک کہوں، غالب کا جواب نہ ہوا ہے، نہ ہوگا، زمانہ جتنی ترقی کرتا جائے گا، غالب کی شاعرانہ حقیقت اتنی ہی زیادہ نمایاں ہوتی جائے گی، اور اس کا یہ شعر قطعاً الہامی ہے:

کوکبم را در عدم اوج قبولے کردہ است — شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

چند نہایت ضروری باتیں

۱- اپنا نمبر خریداری جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے، اسے نوٹ کرلیجئے اور خط و کتابت میں اس کا حوالہ ضرور دیجئے
۲- اگر پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع ۲۰ تک ہمیں نہ ملی تو پھر پرچہ کسی طرح نہیں مل سکتا۔
۳- جواب کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجئے ورنہ جواب کی توقع نہ رکھئے۔